میں ان کی بے احتیاطیوں کا پورا پورا تجربہ کمیشن کو ہو چکا ہے۔ عورتوں کے بارہ میں یہ پورا اطمینان ہے کہ نہ انہوں نے کوئی کام کبھی بے احتیاطی سے کیا ہے نہ آئندہ کوئی اندیشہ ہے کہ اگر طلاق کی تلوار ان کے ہاتھ میں پکڑا دی گئی تو وہ کبھی اس کے استعمال میں بے احتیاطی برتیں گی۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں جو دے دی جاتی ہیں وہ بائن نہ قرار دے دی جائیں بلکہ ان کو ایک ہی شمار کیا جائے اور یہ قانون بنا دیا جائے کہ ازروئے قانون وہی طلاق جائز شمار کی جائے گی جو تین طہروں میں الگ الگ دی گئی ہو۔

کمیشن نے اپنی اس سفارش کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ کی وہ مشہور روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور امارت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جب لوگ طلاق کے معاملہ میں جلد بازی اور بے احتیاطی برتنے لگے تو انہوں نے بطور تعزیر اس طرح دی ہوئی طلاقوں کو بائن قرار دے دیا۔

کمیشن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے خواہ کسی مصلحت سے یہ بات کی ہو، یہ دین میں ایک بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ کمیشن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بعد میں حضرت عمرؓ اپنے اس فعل پر نادم بھی ہوئے اور خود اس بات کا اقرار کیا کہ ان کو دین میں اس طرح کی کسی ایجاد کا حق نہیں تھا اور یہ کہ اس سے لوگوں کو طلاق کے معاملہ میں بڑی ڈھیل حاصل ہو گئی۔

اس مسئلہ کی بابت میری گزارشات حسب ذیل ہیں۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بائن ہونے پر نہ صرف چاروں آئمہ متفق ہیں بلکہ اکثر صحابہ، جمہور تابعین اور جمہور فقہاء سب متفق ہیں یہی مذہب خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمان غنیؓ کا ہے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ کا تھا اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہی مذہب خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی ہے جن کی روایت کی بنا پر کمیشن نے اس مذہب کو بدعت ضلالت قرار دیا ہے۔ قابل ذکر لوگوں میں سے ایک ابن حزم اس کے مخالف ہیں اور متاخرین میں سے امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

انہی دونوں جلیل القدر بزرگوں کی مخالفت نے اس مخالف مذہب میں ایک جان ڈالی۔ ورنہ اس کے خلاف کوئی ایسی آواز سلف یا خلف میں موجود نہیں تھی جس کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت رکھتا ہوں تاہم اس عنوان پر استاد اور شاگرد دونوں کی تحریریں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد میں نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں جمہور کا مذہب اپنے اندر زیادہ قوت رکھتا ہے۔

اس باب میں جو احادیث وارد ہیں ان کے مطالعہ سے یہ دعویٰ تو بالبداہت غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے عہد مبارک میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ حدیثیں دونوں طرح کی ملتی ہیں زیادہ ایسی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقوں کو بائن قرار دیا گیا۔ اور بعض ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا گیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس باب کی حدیثوں میں یہ اختلاف کیوں ہے۔ کیا ایک ہی معاملہ میں حضورؐ نے العیاذ باللہ مختلف اوقات میں مختلف فیصلے فرما دیئے یا اس اختلافِ فیصلہ کی کوئی ایسی وجہ موجود ہے جس کے واضح ہو جانے کے بعد دونوں طرح کی حدیثوں کے الگ الگ محمل متعین ہو جاتے ہیں؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں طرح کی حدیثیں دو مختلف نوعیت کی طلاقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص اٹھتا ہے اور عدد کی تصریح کے ساتھ اپنی بیوی کو مخاطب کر کے یہ کہہ دیتا ہے کہ تجھ پر تین طلاقیں یا تین ہزار طلاقیں یا اتنی طلاقیں جتنے آسمان میں ستارے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص عدد کی تصریح تو نہیں کرتا لیکن تین مرتبہ "تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے" کے الفاظ دہرا دیتا ہے۔ یا اس طرح طلاق دے دیتا ہے جس کو ہمارے فقہاء طلاق البتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی صورت کے جتنے معاملات حضورؐ کے سامنے آئے ان میں آپ نے طلاق کو بائن قرار دیا بلکہ جن میں اعداد طلاق کا اسراف موجود تھا ان کے بارہ میں آپ نے طلاق دینے والے کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ تیری بیوی کے جدا ہونے کے لیے تو ان بہت سی طلاقوں میں سے صرف تین ہی کافی ہیں، بقیہ تیرے حساب میں لکھی جائیں گی اور یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ انہیں معاف کر دے یا ان کے سبب سے تجھے سزا ملے۔ رہی دوسری صورت تو اس طرح کے جو معاملات آنحضرت صلعم کے سامنے پیش ہوئے

ان میں حضورؐ نے طلاق دینے والے کی نیت دریافت کی کہ فی الحقیقت اس طرح کہنے سے اس کا منشا کیا تھا۔ پیش نظر صرف ایک طلاق دینا تھا، لفظ کا اعادہ محض اظہارِ تاکید کے لیے تھا یا وہ فی الواقع تین طلاقیں دینا چاہتا تھا۔ قائل نے اگر قسم کے ساتھ جواب دیا کہ وہ صرف ایک ہی طلاق دینا چاہتا تھا تو اس کی نیت کی بنا پر حضورؐ نے اس کی طلاق کو رجعی قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اگر طلاق دینے والے کے قول میں ادنیٰ گنجائش بھی اس بات کی موجود ہے کہ اس کی طلاق کو طلاقِ رجعی پر محمول کیا جا سکے تو اس کا فائدہ اسے حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن اگر نیت کی بحث کی کوئی گنجائش ہی اس نے نہیں چھوڑی ہے، بلکہ صاف الفاظ میں عدد کی تصریح کے ساتھ طلاق دی ہے تو شریعت اس بات کی اجازت کسی کو نہیں دیتی کہ طلاق اور نکاح کے الفاظ مذاق بنا کر رکھ دیے جائیں۔

مسئلہ کی یہ نوعیت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھی۔ اب آئیے اس سوال پر غور کیجیے کہ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کیا تبدیلی کی جس کا ذکر حضرت ابن عباسؓ نے اپنی روایت میں فرمایا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ جب ان کے سامنے بکثرت معاملات طلاق کے ایسے آئے جن میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کی بداختیاطی کی گئی تھی تو انہوں نے مذکورہ دونوں قسم کی طلاقوں کو خواہ عدد کی تصریح کے ساتھ دی گئی ہوں یا محض تکرارِ الفاظ کے ساتھ، نیت اور ارادہ کا سوال چھیڑے بغیر نافذ کر دیں۔ سیاستِ دین کی رُو سے اس چیز کا ان کو پورا پورا اختیار حاصل تھا۔ کیونکہ یہ نیت کا سوال محض ایک رعایت ہے جس سے وہ لوگ تو فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے تھے جو کم علمی اور بے خبری کے سبب سے ایسا اتفاقیہ کر گزرتے تھے، لیکن جب بار بار کی تاکید و تنبیہ کے بعد بھی لوگ باز نہیں آ رہے تھے، بلکہ اس چیز نے ایک فتنہ کی صورت اختیار کر لی تھی، تو حضرت عمرؓ نے سابق طریقے کو بدل دینا ضروری سمجھا۔ اس فتنہ کو بڑھانے میں اس امر کو بڑا دخل تھا کہ ایک مجلس میں دی ہوئی طلاقوں کی بعض صورتیں ایسی بھی تھیں جن میں معاملہ کا سارا انحصار طلاق دینے والے کی نیت پر رہ گیا تھا۔ ایک شخص جن الفاظ اور جس نیت سے بھی طلاق دے وہ اگر نیک نیت اور صادق القول نہ ہو تو بڑی آسانی کے ساتھ اس پردہ میں اپنے آپ کو چھپا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس طریقۂ طلاق میں بہت بے باک ہو گئے۔ طلاق کا لفظ ایک مذاق بن کے رہ گیا۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس فتنہ کی شدت پوری طرح محسوس کر لی تو اس کا دروازہ بند کر دیا اور ہر طرح کی طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ چونکہ اس کی مصلحت بالکل واضح تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا دروازہ بند کیا تھا جس کو بند ہی ہونا چاہیے تھا اس وجہ سے تمام صحابہؓ نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور اس پر ایک خلیفۂ راشد کی رہنمائی میں تمام اہل علم کا اجماع ہو گیا۔

آخر بار بار کی تفہیم اور تاکیدی ممانعت اور آنحضرت صلعم کے اس ارشاد کے باوجود کہ ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم۔ (کتاب اللہ کے ساتھ یہ مذاق، میری موجودگی میں؟) لوگ اس طریقۂ طلاق میں جو اتنے دلیر ہوتے جا رہے تھے اس کی وجہ یہی تو تھی کہ ہنسوں کے لیے بیوی پر غصہ نکالنے کا یہ ایک ذریعہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت تو ہم نے طلاق مغلظ کی دھونس جما دی ہے بعد میں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کہہ دیں گے کہ ہم نے تو صرف تاکید کے لیے طلاق کا لفظ دہرایا تھا، مقصود تین طلاقیں دینا نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو کسی مسلمان کے لیے اپنے ارادہ کے متعلق غلط بیانی آسان نہ تھی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں ہر شخص کے بارہ میں یہ حسن ظن کیسے کر سکتے تھے کہ وہ ضرور سچ ہی کہتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے دونوں قسم کی طلاقوں کو، اس کو بھی جو عدد کی تصریح کے ساتھ دی گئی ہو اور اس کو بھی جو محض لفظ طلاق کی تکرار کے ساتھ دی گئی ہو ایک ہی درجہ میں رکھا اور دونوں کو نافذ کر کے ہر شخص پر یہ واضح کر دیا کہ اب ایک مجلس میں تین طلاقیں جس شکل میں بھی دی جائیں گی وہ نافذ ہو جائیں گی، کسی کے لیے یہ کہنے کا اب موقع باقی نہیں رہا کہ میں نے صرف طلاق طلاق کا لفظ دہرایا تھا، نیت طلاق بائن کی نہ تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بدعت ہے اور بدعت بھی بدعت ضلالت؟ اگر یہ بدعت ہے تو تمام صحابہ و تابعین اور تمام ائمہ و فقہا اس پر کس طرح متفق ہو گئے۔ صحابہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کس طرح موقع دے دیا کہ انہوں نے اتنی بڑی بدعت کر ڈالی اور کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔ حضرت عمرؓ کوئی مستبد بادشاہ نہ تھے، کمیشن کو خود اقرار ہے کہ ایک عورت بھی برسر منبر ان کو ٹوک دیتی تھی اور وہ بڑی فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ اس کی بات سنتے اور اس کو قبول کر لیتے تھے۔ ایک ایسے مثالی

عہد میں یہ کس طرح ممکن ہوا کہ حضرت عمرؓ ایک اتنی بھاری بدعت کر گزریں اور لوگ چپ چاپ دیکھتے رہیں، کوئی زبان اس کے خلاف نہ کھلنے پھر لطف یہ کہ صرف ایک ہی خلیفہ راشد نہیں بلکہ بعد کے دونوں خلفاء بھی اس پر متفق اور ان کے زمانوں کے تمام علماء و فقہاء بھی اس پر مطمئن رہے۔ اگر یہ بدعت ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہ پوری امت العیاذ باللہ ایک بدعت ضلالت پر متفق ہو گئی درآنحالیکہ حدیث میں آیا ہے کہ یہ امت ضلالت پر کبھی متفق نہیں ہو گی۔ پھر یہ بیان بھی عجیب و غریب ہے کہ حضرت عمر بعد میں اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوئے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو آخر انہوں نے ندامت محسوس کرتے ہی اس فیصلے کو بدل کیوں نہ دیا؟ کیا حضرت عمرؓ ضدی اور ہٹ دھرم تھے کہ دین کے معاملے میں اپنی ایک غلطی محسوس کر کے بھی اس پر جمے رہے؟ اور اگر کسی وجہ سے انہوں نے اس غلطی کی تلافی نہ کی تھی تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے کیوں نہ اس کی اصلاح کی؟

جن لوگوں نے اس کو طلاق بدعی کہا ہے انہوں نے ہرگز اس سے وہ بدعت مراد نہیں لی ہے جس کو کمیشن نے بدعت ضلالت (UNDESIRABLE INNOVATION) یا غیر اسلامی (UN-ISLAMIC) قرار دیا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد طلاق کا وہ طریقہ ہے جو اگرچہ جائز تو ہے لیکن معیاری سنت سے ہٹا ہوا ہے۔

دین کے اکثر احکام کے بجا لانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو وہ طریقہ ہے جس طریقہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کو انجام دیا ہے یا انجام دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ معیاری اور مثالی طریقہ ہے۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس طریقہ پر اگر وہ انجام دے دیا جائے تو اگرچہ وہ دین میں حد جواز کے اندر تو آجائیگا لیکن معیاری طریقہ پر انجام نہ پانے کے سبب سے وہ صحیح طریقہ سنت سے ہٹا ہوا سمجھا جائے گا۔ چونکہ دین میں مطلوب معیاری سنت ہے اس وجہ سے اہل علم و تقویٰ اپنے اپنے دائرہ کے اندر اس کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وضو کو لیجیے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی نیت اور بسم اللہ کے ساتھ وضو کا ارادہ کرے، پہلے کفین کو دھوئے، پھر کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے، پھر تین تین مرتبہ اہتمام کے ساتھ ترتیب اور تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعضائے وضو کو دھوئے، پھر پورے سر کا مسح کرے، پھر پاؤں دھوئے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ایڑیوں کا کوئی حصہ خشک نہ رہنے پائے، پھر وضو کی دعا

ٹپہ کر وضو کو تمام کرے۔ یہ وضو کا معیاری طریقہ ہوا۔ اس کی ایک دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی مذکورہ باتوں میں سے بعض مستحبات کو ترک کر دے، یا ترتیب میں کچھ گڑبڑ کر دے، یا سر کے مسح کے معاملہ میں پورا اہتمام نہ کرے صرف سر کے ایک قلیل حصہ ہی کا مسح کر کے چھوڑ دے۔ وضو ہونے کو تو اس طرح بھی ہو جائے گا لیکن معیاری سنت کے خلاف ہو گا۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کی تفصیلات پڑھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک تو حج کا وہ طریقہ تھا جس طریقہ پر خود حضورؐ نے یا صحابہؓ علم صحابہؓ نے حج کیا اور ایک طریقہ وہ تھا جس طریقہ پر ان لوگوں نے حج کیا جن کو مناسکِ حج کی پوری تفصیلات کا اچھی طرح علم نہیں تھا۔ اس طرح کے کتنے لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مناسک کی ادائیگی کے معاملہ میں اپنی مختلف کوتاہیوں یا ترتیب کی غلطیوں کا ذکر کیا۔ آپ نے ان کی غلطیوں کی تو اصلاح فرمائی لیکن کسی کو یہ نہیں فرمایا کہ تمہارا حج ہی نہیں ہوا۔

اسی طرح طلاق دینے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سکھایا ہے۔ یہ طریقہ معیاری طریقہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر اسی طریقہ پر طلاق دی جائے گی تب تو طلاق واقع ہو گی اور اگر اس طریقہ پر نہیں دی جائے گی تو سرے سے واقع ہی نہیں ہو گی۔ واقع تو ہو جائے گی البتہ چونکہ معیاری طریقہ پر نہیں ہو گی اس وجہ سے ان برکتوں سے خالی ہو گی جو معیاری طریقہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ جب آپ کے سامنے طلاق کے ایسے معاملات آئے جن میں جلد بازی اور بے احتیاطی کی گئی تھی تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوئی بلکہ یہ فرمایا کہ طلاق تو واقع ہو گئی لیکن سنت کی خلاف ورزی ہوئی، اور بعض مرتبہ اس طرح کے واقعات پر تنبیہ بھی فرمائی کہ "یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے درآنحالیکہ میں ابھی تمہارے اندر موجود ہوں"۔

اب گویا طلاق کے دو طریقے ہوئے۔ ایک معیاری طریقہ، سنت کے ٹھیک ٹھیک مطابق اور دوسرا صحیح سنت سے تو ہٹا ہوا لیکن حدِ جواز کے اندر۔ تعبیر کرنے والوں نے جب ان دونوں کو الگ الگ تعبیر کرنا چاہا تو ایک کے لیے تو بنی بنائی اصطلاح طلاقِ سنت کی مل گئی اس وجہ سے اس کو طلاقِ سنت سے تعبیر کر دیا۔ اب رہ گیا دوسرا، تو طلاق سنت کی اصطلاح کے مقابل میں دوسری اصطلاح طلاق بدعی

ہی کی ہو سکتی تھی، چنانچہ اس کے لیے طلاق بدعی کی اصطلاح چل پڑی۔ لیکن اس کے طلاق بدعی ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ یہ بدعت ضلالت ہے بلکہ اس سے مراد طلاق کا وہ طریقہ ہے جو معیاری سنت سے ہٹا ہوا ہے اگر بدعت سے مراد یہاں بدعت ضلالت ہوتی تو آخر وہ لوگ اس اصطلاح کو کیوں اختیار کر لیتے جو اس طریقہ طلاق کو بدعت نہیں سمجھتے بلکہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ان کے اس تعبیر کو قبول کر لینے کی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس کو اصطلاحی بدعت سمجھا۔ اگر وہ اس کو حقیقی بدعت سمجھتے تو اس کے جواز کے قائل کس طرح ہوتے؟

یہ مسئلہ کی اصلی صورت ہے جو اس باب کی احادیث کے تدبر سے واضح ہوتی ہے۔ جو شخص بھی غور وفکر کے ساتھ ان احادیث کا مطالعہ کریگا ان شاء اللہ اسی نتیجہ تک پہنچے گا جس نتیجہ تک میں پہنچا ہوں۔

اب میں نیل الاوطار سے دونوں طرح کی حدیثیں یہاں پیش کیے دیتا ہوں۔ ان حدیثوں پر اگرچہ مخالفین اور موافقین کی طرف سے بہت کچھ کہا بھی گیا ہے اور ان میں سے بعض کے اندر ضعف کے اسباب بھی موجود ہیں لیکن ان فنی اور اصطلاحی خامیوں کے سبب سے اس قدر مشترک پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو ان حدیثوں کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سامنے آتا ہے۔

پہلے وہ حدیثیں لیجیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقوں کو بائن قرار دیا ہے۔

حسن سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق حالت حیض میں دے دی۔ پھر ارادہ کیا کہ آئندہ دو طہروں میں دو طلاقیں اور دے دیں گے۔ اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اے ابن عمرؓ! اللہ تعالیٰ نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے، تم نے سنت کے طریقہ کے خلاف کیا ہے، سنت یہ ہے کہ طلاق کے لیے طہر کا انتظار کرو، پھر ہر طہر میں ایک طلاق دو۔ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنی بیوی سے مراجعت کر لی پھر آپ نے فرمایا کہ جب وہ پاک ہو جائے تو چاہے طلاق دو چاہے رکھو۔ عبداللہ بن عمرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اگر میں نے اس کو تین طلاقیں دے چھوڑی ہوتیں تو

کیا میرے لیے اس سے مراجعت جائز ہوتی؟ حضور نے فرمایا نہیں، تمہاری بیوی تم سے جدا ہو جاتی اور اس طرح طلاق دینا ایک معصیت ہوتا۔ (دار قطنی)

"سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب بنی عجلان کے بھائی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس نے کہا کہ یا رسول اللہ، میں بڑا ہی ظالم ہونگا اگر اس کے بعد بھی اس کو بیوی بنائے رکھوں۔ سو اب میری طرف سے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے (رواہ احمد)

"عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو بیک وقت ہزار طلاقیں دے دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ ان میں سے تین کا اسے حق تھا، بقیہ ۹۹۷ سب ظلم و زیادتی ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دیگا اور اگر چاہے گا تو سزا دیگا"

ایک دوسری روایت میں یہی بات اس طرح بیان ہوئی ہے "تمہارے باپ نے خدا کا خوف نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے راہ پیدا کرتا۔ اس کی بیوی تین طلاقوں سے اس سے جدا ہو گئی اور یہ بات سنت کے خلاف ہوئی۔ ۹۹۷ طلاقیں اس کی گردن میں ہونگی" (بحوالہ مصنف عبدالرزاق)

جو لوگ اس مذہب کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح طلاق دینے سے ایک ہی طلاق پڑتی ہے ان کا اعتماد دو حدیثوں پر ہے۔ ان میں سے ایک رکانہ بن عبداللہ والی حدیث ہے جس کا حوالہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بھی دیا ہے۔ اس حدیث کا مضمون دو طریقوں سے بیان ہوا ہے۔

ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاقیں دی تھیں لیکن ان کی نیت معلوم کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تین طلاقوں کو ایک ہی قرار دیا۔ اسی واقعہ کی روایت ابوداؤد اور دار قطنی میں اس طرح ہے کہ یہ طلاق البتہ[1] کی صورت میں تھی جس میں فیصلہ کا انحصار طلاق دینے والے کے قصد و نیت

---

[1] طلاق "البتہ" کا مطلب یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہہ بیٹھے کہ تجھ کو قطعی طلاق ہے" اس صورت میں طلاق دینے والے کی نیت دیانت کی جائیگی اگر وہ کہے کہ اس نے قطعی کے لفظ سے تین طلاقیں مراد لی ہیں تو یہ طلاق بائن ہوگی۔ اور اگر وہ کہے کہ قطعی کا لفظ اس نے محض تاکید اور زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، مقصود ایک طلاق سے زیادہ نہیں ہے تو یہ طلاق رجعی ہوگی۔

پر ہوتا ہے۔ چونکہ رکانہ نے قسم کھا کر حضورؐ کے سامنے یہ کہا کہ وہ ایک ہی طلاق کا ارادہ رکھتے تھے اس وجہ سے حضورؐ نے ان کی طلاق کو رجعی قرار دیا۔ ابو داؤد میں یہ روایت اس طرح ہے اور اس کو انہوں نے حسن صحیح کا درجہ دیا ہے :-

"رکانہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتہ دے دی اور جا کر اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ خدا کی قسم میری مراد ایک طلاق سے زیادہ نہ تھی۔ حضورؐ نے فرمایا، قسم کھاتے ہو کہ تم نے ایک سے زیادہ کا ارادہ نہیں کیا تھا؟ رکانہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں نے ایک سے زیادہ کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی ان کو واپس کرا دی۔

دوسری روایت حضرت ابن عباس کی وہ مشہور روایت ہے جس کا حوالہ ہم بحث کے آغاز میں دے چکے ہیں۔ اس کا مضمون یہ ہے۔

"طاؤس، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں نیز حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگ ایک ایسے معاملہ میں بڑی جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں جس میں ان کو صبر اور انتظار کی ہدایت کی گئی تھی تو ہم ان کی طلاقیں نافذ کیوں نہ کر دیں (مسلم)

اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ تین طلاقیں خواہ کسی صورت میں دی گئی ہوں حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک ایک ہی سمجھی جاتی تھیں تب تو یہ روایت بلا شبہ اوپر والی ان حدیثوں کے خلاف پڑتی ہے جن سے تین طلاقوں کا بائن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابو داؤد میں یہ جن الفاظ میں وارد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر مدخولہ بیوی سے متعلق ہے اور بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ اس صورت سے متعلق ہے جب طلاق دینے والا عدد کی تصریح کے بغیر محض لفظ طلاق کی تین مرتبہ تکرار کر دے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی صورت پر بھی اس کو محمول کر دیا جائے تو اوپر کی حدیثوں کے ساتھ یہ جمع ہو جاتی ہے۔

یہ امر بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں خود

ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بائن مانتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں راوی کی روایت دیکھنی چاہیے نہ کہ اس کا مذہب۔ لیکن یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جیسے فقیہ صحابی اگر ایک طرف یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، اور پھر فتویٰ اس کے خلاف دیتے ہیں تو یہ صاف دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں وہ یا تو لفظ طلاق کی تکرار والی ہوتی تھیں یا غیر مدخولہ بیوی سے متعلق تین طلاقوں کی جو عام صورت ہے اس سے متعلق ان کا یہ بیان نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے مذہب کے بارہ میں مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ ہوں۔

"مجاہد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں ابن عباسؓ کے پاس موجود تھا کہ ایک شخص نے ان سے آکر بیان کیا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کی خاموشی سے میں نے گمان کیا کہ شاید وہ اس طلاق کو رجعی قرار دیں گے۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ لوگ پہلے حماقت کر گزرتے ہیں، اس کے بعد یہاں آکر اے ابن عباس! اے ابن عباس! پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اس سے ڈرتا ہے وہ اس کے لیے راہ پیدا کرتا ہے۔ تم چونکہ اس سے نہیں ڈرے اس وجہ سے میں تمہارے لیے کوئی راہ بھی نہیں پا رہا ہوں۔ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہو گئی۔ (ابو داؤد)

"مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس سے ایک ایسے شخص کے بارہ میں فتویٰ پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو اکٹھی سو طلاقیں دے چھوڑی تھیں۔ انہوں نے طلاق دینے والے سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی (یعنی قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف طلاق دی) اور اپنی بیوی سے محروم ہوا۔ تم خدا سے ڈرے نہیں ورنہ تمہارے لیے راہ پیدا کرتا۔"

"سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دیں۔ حضرت ابن عباس سے فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے طلاق دینے والے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تیری بیوی کے

جُدا ہونے کے لیے تو ان میں سے صرف تین کافی ہیں۔ ۹۹۷ تیرے پاس بچ رہیں گی۔"

انہی سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو آسمان کے تاروں کی تعداد میں طلاق دے دی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس نے سنت کے طریقہ کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی (دار قطنی)۔

ان تمام روایات پر اگر ایک شخص تطبیق کے ارادہ سے غور کریگا تب تو وہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہو جائے گی جو ہم نے پیش کی ہے، اور اگر صرف ایک ہی قسم کی روایات کو لے کر بقیہ کو نظر انداز کر دینا چاہے گا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کو اور ان کے ساتھ ساتھ ساری امت کو مبتدع قرار دے۔

اب غور کیجیے کہ کمیشن کی سفارش اگر قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ طلاق کا لفظ گھر گھر میں ایک سخن تکیہ بن کر رہ جائے گا۔ جو لفظ زبان سے نکالتے ہوئے آج ہر شخص ڈرتا ہے اور بہت دُور تک اس کے نتائج پر غور کرتا ہے۔ وہ لفظ بات بات پر زبان سے نکلیگا اور بہت ممکن ہے کہ زیادہ عرصہ نہ گذرے کہ یہ شوہروں کی طرف سے بیویوں کے لیے ایک پیار کا کلمہ بن کے رہ جائے۔ پیغمبر نے تو فرمایا ہے کہ یہ لفظ اگر مذاق سے بھی زبان سے نکل جائے تو یہ حقیقت ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کی کوئی حقیقت نہیں رہ جائے گی۔ جو شخص اٹھے گا معمولی برہمی پر بھی ایک ہی سانس میں دس ہزار طلاقیں دے ڈالے گا اور جب غصہ اُتر جائے گا تو مسکرا کر کہہ دیگا کہ بیگم میں نے تو رجوع کر لیا ہے۔ ایک آدھ ماہ کے ناغہ کے بعد وہ پھر اسی طرح طلاق دیگا اور پھر رجوع کرے گا۔ الغرض ایک شخص اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے ہزار مرتبہ اپنی بیوی کو طلاق دیگا اور کتنے ہزار مرتبہ رجوع کریگا۔ یہاں تک کہ کثرت استعمال سے یہ لفظ اتنا بے معنی اور بے اثر ہو کر رہ جائے گا کہ معاشرہ میں مطلقہ اور غیر مطلقہ میں کوئی امتیاز ہی سرے سے باقی نہیں رہ جائے گا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے اسی فتنہ کا دروازہ بند کیا تھا۔ اب اگر اس دروازہ کو چوپٹ کھول دینا ہے تو کھول دیجیے۔ لیکن اس بات کو خوب یاد رکھیے

کہ اس سے طلاق کی تعدادوں میں کمی نہیں ہو گی جیسا کہ گمان کیا جا رہا ہے۔ طلاقیں نیسے شمار ہونگی اور بات بات پر ہونگی لیکن لوگ طلاق اور نکاح کے فرق کے احساس سے عاری ہو جائیں گے۔

ہمارے نزدیک اس معاملہ میں صحیح راہ یہی ہے کہ مسلک جمہور کے خلاف کوئی قانون بنانے کی حماقت نہ کی جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح طلاق دینے والے کے لیے قانون میں کوئی سزا بھی مقرر کی جائے تاکہ کتاب اللہ کے ساتھ استہزا کا دروازہ بند ہو۔ جس کو طلاق دینا ہو وہ صحیح طریقہ پر طلاق دے تاکہ کتاب اللہ کی توہین سے بھی محفوظ رہے اور جلد بازی کے تلخ سے بھی۔ مصنف عبدالرزاق میں ایک روایت ہے کہ:

"حضرت عمرؓ کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جس نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی کو سچ مچ طلاق دی ہے؟ اس نے کہا نہیں، میں نے تو مذاق کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی کوڑے سے خبر لی اور فرمایا کہ طلاق کے لیے تو ان میں سے صرف تین ہی کافی ہیں۔"

اس کے علاوہ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کو اپنے اپنے مسلک پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بات دستور کے بالکل مطابق ہو گی۔ دستور میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ پرسنل لا کے معاملات میں ہر فرقہ کے لیے کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہونگی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کریں گے۔ جہاں میاں بیوی دونوں ایک ہی فرقہ سے تعلق رکھتے ہونگے وہاں تو کسی زحمت کا سوال نہیں ہے۔ البتہ جہاں اختلاف ہو وہاں شوہر کا مسلک اصل قرار پائے۔

طلاق کی رجسٹری کمیشن نے نکاح کی طرح طلاق کے لیے بھی رجسٹری کی سفارش کی ہے اور اس کے دو طریقے تجویز کیے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جو نکاح کی رجسٹری کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ معیاری نکاح نامہ کی طرح ایک معیاری طلاق نامہ ہو۔ اس کے فارم ہر ڈاک خانے سے آٹھ آنے میں مل سکیں۔ اس میں طلاق کی نوعیت کی پوری تفصیل درج ہو کہ کس شکل میں دی گئی ہے: ایک مجلس میں یا تین الگ طہروں میں، اس کی ایک کاپی مطلقہ کے پاس رہے، دوسری طلاق دینے والے کے پاس اور تیسری کاپی کو طلاق دینے والا تحصیلدار کے پاس رجسٹری کر کے بھیج دے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کو پانچسو روپے

تک جرمانہ کی سزا ہو۔

لیکن کمیشن کو اس مشکل پر پورا اطمینان نہیں ہے کہ یہ عورت کے حقوق کے تحفظ کے لیے کافی ہے۔ اس کا تاثر یہ ہے کہ مرد بسا اوقات ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر بیوی اور اس کے بچوں کو گھر سے باہر نکال پھینکتا ہے اور دوسری بیوی گھر میں لا بساتا ہے۔ ان مظلوموں کے پاس نہ پیٹ پالنے کا کوئی ذریعہ ہوتا نہ آسمان کی چھت کے سوا ان کے سروں پر کوئی چھت ہوتی۔ اس وجہ سے کمیشن نے دوسری قابلِ اطمینان تجویز یہ پیش کی ہے کہ طلاق کا ہر معاملہ شادی بیاہ کی مجوزہ عدالتوں میں پیش ہو اور عدالت اس وقت تک کسی شخص کو طلاق کی اجازت نہ دے جب تک وہ یہ اطمینان نہ کرے کہ مطلقہ کا پورا مہر ادا کر دیا گیا ہے اور اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کا قابلِ اطمینان انتظام کر دیا گیا ہے۔ اگر مہر کی ادائیگی بالاقساط ہونی ہے تو اس کی اقساط بھی عدالت کی طرف سے معین ہو جانی چاہئیں۔

اس کی پہلی شکل پر مجھے وہی اعتراض ہے جو میں نکاح کی رجسٹری کے سلسلہ میں پیش کر چکا ہوں۔ اگر رجسٹری کی یہ سادہ شکل اختیار کی گئی تو تحصیلدار کا رجسٹر جھوٹی سچی اور فرضی رپورٹوں کی ایک ضخیم سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا اور جن جھگڑوں سے بچنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی جا رہی ہے ان میں کمی ہونے کے بجائے اس کے سبب سے بھی زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے اثرات کی صحیح تصویر ذہن کے سامنے لانے کے لیے میری مذکورہ بحث پھر پڑھ لیجیے۔

رہی دوسری صورت تو اس پر مجھے مختلف پہلوؤں سے اعتراضات ہیں اور یہاں میں ان کی طرف بعض اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کمیشن نے طلاق کے معاملات میں مرد کو بہر صورت ایک مجرم مان لیا ہے کہ وہ بس یونہی طلاق دے ڈالتا ہے، بیوی بچوں کو سڑک پر بے سہارا چھوڑ دیتا ہے، نئی بیوی گھر میں لا بساتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورتِ حال کا بالکل یک طرفہ جائزہ ہے۔ طلاق کے سو واقعات میں سے دو چار واقعات اس نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کہا جائے کہ سارے واقعات یا اکثر واقعات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں تو یہ ایک نہایت غلط اندازہ ہے جو محض صوفوں پر بیٹھ کر

لگا دیا گیا ہے۔ مرد عموماً طلاق کے معاملہ میں اتنا بے احتیاط اور ظالم نہیں ہوتا جتنا ارکانِ کمیشن نے اس کو فرض کر لیا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ بیوی کی بدزبانی، اس کی بداخلاقی اور اس کی جھگڑالو طبیعت سے تنگ آکر اور بالکل بے بس و مجبور ہو کر طلاق دیتا ہے۔ کم از کم غربا اور عوام کے طبقہ میں زیادہ تر طلاقیں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کو نئی بیوی لانے کا شوق اتنا نہیں ہوتا جتنا ارکانِ کمیشن نے سمجھ رکھا ہے۔ ایسی صورت میں مہر کا معاملہ تو خیر ایک شرعی ذمہ داری ہے، اور بچوں کی کفالت بھی قابلِ لحاظ ہے، لیکن عدالت کو یہ کس شرع کی رو سے حق ہے کہ وہ مرد سے مطلقہ کی کفالت کی ضمانت طلب کرے؟ مطلقہ کی کفالت تو مرد کے ذمہ زمانہ عدت میں ہے، اور اگر وہ حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک، اور اگر وہ اس کے بچے کو دودھ پلائے تو زمانہ رضاعت میں۔ ان زمانوں کے سوا مرد پر مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری نہ شریعت نے ڈالی ہے اور نہ عقل اس کو جائز رکھتی ہے۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ طلاقیں بالعموم غربا کے طبقہ میں ہوتی ہیں اور عام طور پر ان کے اسباب معاشی ہوتے ہیں۔ بیوی کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں جس کے سبب سے میاں بیوی میں تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے اور پھر نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ اب اگر ایک شخص معاشی افلاس سے مجبور ہے اور اس مجبوری ہی نے طلاق تک نوبت پہنچائی ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس سے مہر اور بچوں کی کفالت کے ساتھ ساتھ مطلقہ کی کفالت کی بھی ضمانت مانگی جائے۔ اگر وہ یہ ضمانت دے سکتا تو بیوی کو طلاق ہی کیوں دیتا؟ اب فرض کیجیے کہ یہ ضمانت نہ دے سکنے کی وجہ سے عدالت اس کو طلاق دینے کی اجازت ہی نہیں دیتی تو اس سے زیادہ نامعقول حرکت اور کیا ہوگی؟ کیا عدالت کی اس مداخلت کی وجہ سے ان کی معاشی مشکل حل ہو جائے گی اور وہ لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں گے اور ان کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے؟ ہر شخص ان سوالوں کا یہی جواب دیگا کہ نہیں۔ بلکہ ہوگا یہ کہ مرد پہلے سے بھی زیادہ اپنی اس بیوی کو اپنے لیے عذابِ جان سمجھے گا اور عورت بھی اپنی قسمت پر ماتم کریگی کہ نہ رہائی ملتی ہے نہ روٹی۔ پھر عدالت کی اس مداخلت سے کیا فائدہ حاصل کرنا پیش نظر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شریعت نے تو طلاق کا حق مرد کو دیا ہے، آپ کس قاعدے سے یہ

حق مرد سے چھین کر عدالت کے حوالہ کر رہے ہیں۔ کیا اس پر کوئی شرعی یا عقلی دلیل ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حق مرد سے چھین کر عدالت کے حوالہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ عدالت اس حق کو مرد کی نسبت زیادہ احتیاط کے ساتھ استعمال کریگی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو بیوی بنا کر رکھنا عدالت کو ہے یا مرد کو؟ اگر مرد ہی کو ہے اور وہ بیوی سے بیزار ہے، اس کو بسانے کے لیے تیار نہیں، تو عدالت اس معاملہ میں مداخلت کر کے کیا بنائے گی؟ وہ زیادہ سے یہی تو کر سکتی ہے کہ مرد کو طلاق دینے کی اجازت نہ دے۔ لیکن اس اجازت نہ دینے سے اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ مرد کی بیزاری عورت سے اور زیادہ بڑھ جائے گی اور عورت کی زندگی اس گھر میں اجیرن ہو کے رہے گی۔ عدالت کا کام کسی جھگڑے کا فیصلہ کر دینا ہے، خوشگوار گھریلو زندگی پیدا کرنا اور بیوی کو محبت کرنے والا شوہر دلوا دینا عدالت کے امکان میں نہیں ہے۔ رہا مہر وغیرہ کی ادائیگی کا معاملہ تو اس کو جھگڑا بننے سے پہلے ایک جھگڑے کی حیثیت دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ طلاق کے واقعات میں سے کچھ ہی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر کا معاملہ نزاعی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان کے طے کرنے کے لیے اگر کمیشن کی مجوزہ شادی بیاہ کی عدالتیں موجود ہوں تو عورت کے ساتھ کسی ناانصافی کا اندیشہ نہیں ہے پھر بغیر کسی نزاع کے پیدا ہوتے آخر ہر واقعہ طلاق کو ایک مقدمہ کیوں بنا لیا جائے اور اس کو عدالتوں میں کیوں نہ پیش کیا جائے؟

تیسری بات یہ ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق کی خواہش بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر ہوتی ہے جن کو وہ خود ہی محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کو محسوس نہیں کرا سکتا وہ جب محسوس کرتا ہے کہ بیوی سے کسی طرح اس کا نباہ نہیں ہو سکتا تو بالآخر طلاق دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک عدالت یہ فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھ جائے کہ ارادۂ طلاق کے وجوہ معقول ہیں یا نہیں تو شوہروں کو مجبوراً اپنی بیزاری کے اصل اسباب چھپا کر بیویوں پر ایسے الزامات لگانے پڑیں گے جنہیں کوئی عدالت معقول وجہ طلاق مان سکے، اور یہ الزامات بیشتر اخلاقی نوعیت کے ہونگے، جیسا کہ آج کل یورپ میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ یورپ میں تو ممکن ہے کہ ایک عورت ایسے الزامات لگنے کے باوجود باعزت رہ سکے لیکن ہمارے

ملک میں جس عورت کو ان الزامات کی بنا پر عدالت سے طلاق ملیگی اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائے گی اور ان مقدمات کے چرچے جب عدالتوں سے باہر ملک میں پھیلیں گے تو معاشرے کی رہی سہی اخلاقی حالت بھی برباد ہو کر رہے گی۔

مولانا احتشام الحق کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ اگر مرد معاہدۂ نکاح میں یہ شرط تسلیم کرلے کہ میں اگر منکوحہ کو طلاق دونگا تو شادی بیاہ کی عدالت ہی کے ذریعہ سے دونگا تو مرد کا یہ حق عدالت کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ چونکہ مولانا احتشام الحق صاحب کی اپنی بات ہمارے سامنے نہیں آئی ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے کیا کہا ہوگا اور کمیشن نے اپنے مطلب کے لیے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ نکاح کے شرائط اور تفویض و توکیل وغیرہ پر میں پچھلے صفحات میں عورت کے حقِ طلاق کی بحث کے ضمن میں گفتگو کر چکا ہوں۔ ان تمام مباحث کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معاہدۂ نکاح میں اس شرط کو ہر مرد کے لیے از روئے قانون تسلیم کرنا ضروری ہوگا یا اختیاری؟ اگر اختیاری ہوگا تو ہمارے اندر کتنے مرد ایسے نکلیں گے جو یہ شرط تسلیم کرنے پر راضی ہونگے؟ اور اگر لازمی ہوگا تو یہ صریح اکراہ ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ شرائطِ نکاح میں کوئی چیز بالجبر ٹھونسی جاسکتی ہے اور نہ وہ تفویض یا تملیک یا توکیل از روئے شرع جائز ہے جس میں جبر و اکراہ کا شائبہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے معاملات میں عدالتوں کی مداخلت ان کی فطرت کے بالکل منافی ہے۔ ان کی بنیاد میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگواری اور ناخوشگواری پر ہے۔ عدالتیں فصلِ مقدمات کا ایک ذریعہ تو بن سکتی ہیں لیکن میاں بیوی میں باہمی اعتماد اور سنجوگ پیدا کرنا ان کا کام نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے میاں اور بیوی کے معاملات میں عدالتوں کی مداخلت زیادہ پسند نہیں کی ہے۔ اگر حقوق کا کوئی جھگڑا پیدا ہو گیا ہے تو عدالت اس کا فیصلہ کردے۔ اگر مرد کی طرف سے کوئی تعدی ہو رہی ہو تو عدالت اس کو روک دے۔ اگر عورت مرد سے چھٹکارا چاہتی ہے اور عدالت مطمئن ہو کہ اس مرد سے اس کا نباہ نہیں ہو سکتا تو وہ اس کے نکاح کو فسخ

کر دے۔ یہ کام عدالت کے کرنے کے ہیں۔ لیکن اگر میاں بیوی کے سارے ہی معاملات عدالتوں ہی کے ذریعہ سے طے پانے لگے تو پھر میاں بیوی کا تعلق بس ضابطہ کا ایک سرکاری تعلق بن کے رہ جائے گا۔ اور جب یہ ذہنیتیں تبدیل ہو جائیں گی تو جہاں سے کسی نزاع کے بھی پیدا ہونے کا امکان نہ ہو گا وہاں سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع اٹھ کھڑی ہو گی۔

مطلقہ کی کفالت کمیشن نے سفارش کی ہے کہ شادی بیاہ کی عدالتوں کو اختیار ہونا چاہیے کہ جن عورتوں کو بلا کسی "سبب معقول" کے ادھیڑ پن میں طلاق دے دی جاتی ہے ان کی کفالت کا بار تا عقد ثانی یا مدت العمر کے لیے شوہر پر ڈال دیں۔

اس سفارش کی تائید میں کوئی اس طرح کی لنگڑی لولی دلیل بھی دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جس طرح کی دلیلیں دینے کا کمیشن عادی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے مرد پر مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری یا تو زمانۂ عدت میں ڈالی ہے یا زمانۂ حمل میں یا زمانۂ رضاعت میں۔ ان صورتوں کے سوا کسی اور صورت میں مطلقہ کی کفالت کی کوئی ذمہ داری مرد پر نہیں ہے اور یہی عقل اور انصاف کا بھی تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ سفارش ہمدردیٔ نسواں کے جذبہ کے تحت کی گئی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اپنی جگہ یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اس ہمدردی کا بوجھ حکومت کو اٹھانا چاہیے نہ کہ غریب طلاق دینے والے کو، جس نے نہ معلوم کن مجبوریوں کے تحت طلاق دی ہے۔

یہ سفارش اگر قانون کی شکل اختیار کرے تو اس سے عورتوں ہی کو مختلف پہلوؤں سے نقصان پہنچے گا۔ ہر عورت کے وجوہ طلاق عدالتوں میں زیر بحث آئیں گے اور مردوں کو کفالت کے بار سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے وجوہ طلاق کو نہایت وزنی بنانا پڑے گا۔ یوں تو طلاق کے وجوہ کا زیر بحث آنا مرد یا عورت میں سے کسی کے لیے بھی مفید نہیں ہے۔ لیکن کمزور فریق ہونے کی وجہ سے عورت کے لیے یہ چیز نہایت مضر ہے۔ ہمارے معاشرہ کا حال یہ ہے کہ طلاق بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو عورت کی حیثیت کو خاصی حد تک مجروح کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ طلاق عدالت میں زیر بحث